عربی مدارس کا موجودہ نصاب تعلیم

طفیل احمد قریشی۔ ایم۔ اے

درس گاہیں قومی زندگی میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور ان کا نصاب قومی فکر و نظر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین تعلیم وقتاً فوقتاً نصاب تعلیم کا جائزہ لیتے رہتے ہیں اور وقتی مصالح اور ضرورتوں کے پیش نظر اس میں ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مسلمان ہر دور میں پرانی تحقیقات کے ساتھ ساتھ نئے افکار کا مطالعہ کرتے رہے اور نئے علوم و فنون میں اقوام عالم کی رہبری کرتے رہے ایک زمانے میں بغداد و قرطبہ علوم و فنون کے بڑے اہم مراکز تھے اور تشنگان علم دور دراز سے آتے اور ان سرچشموں سے سیراب ہو کر جاتے تھے۔ مسلمانوں کے دور عروج میں ان کے نظام تعلیم کی یہ خصوصیت تھی کہ ان کے زیر درس صرف قرآن و حدیث ہی کی تعلیمات نہیں رہیں بلکہ حیات انسانی کے مختلف شعبوں میں جو ترقیاں محققین کرتے رہے، وہ بھی داخل نصاب تھیں۔ قال اللہ و قال الرسول کے ساتھ ان کے ہاں قال ارسطا طالیس و بطلیموس وغیرہ بھی داخل تدریس تھے۔ آیات اللہ فی کتاب المجید کے ساتھ آیات فی الافاق (کائنات) کے عقدے بھی حل ہوتے تھے۔ اور یہی طرز تعلیم اس زمانے میں مسلمانوں کو دیگر اقوام کے نظامہائے تعلیم سے ممیز بھی کرتا تھا۔

مسلمانوں کے تدریسی نظام کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ علوم نقلیہ :۔ قرآن پاک، تفسیر قرآن، حدیث اور فقہ وغیرہ کی تعلیم۔

۲۔ علوم آلیہ :۔ وہ علوم جو علوم نقلیہ اور دوسرے علوم کی تحصیل میں لوازم و مبادی خیال کئے جاتے ہیں، جیسے صرف و نحو، کلام۔ بلاغت۔ منطق۔ اصول فقہ، اصول حدیث، اصول تفسیر، علم الرجال

۳۔ علوم عقلیہ :۔ علوم کی اس شق میں معاشی، معاشرتی، فکری اور فنی علوم کی تمام شاخیں شامل ہیں۔ اموی، عباسی یا فاطمی دور کے نظام تعلیم سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم صرف یہاں برِّ صغیر پاک و ہند کے نصاب تعلیم کا سرسری جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری کے ایک مشہور عرب سیاح المقدسی کے بیان کے مطابق پہلی صدی ہجری میں ہی مسلمان سرزمین سندھ میں ہندوستان کو اپنے علوم سے روشناس کرا چکے تھے۔ لیکن فرشتہ کی نظر میں اسلامی نظام تعلیم کی ابتدا محمود غزنوی کے دور سے ہوتی ہے۔ محمود غزنوی صرف فاتح ہی نہیں بلکہ بہت بڑا علم دوست بھی تھا۔ ہندوستان میں اپنے مفتوحہ علاقوں کے نظم و نسق کے ساتھ ساتھ اس نے یہاں جا بجا مدارس بھی کھلوائے۔ چنانچہ فرشتہ محمود کے تذکرہ میں لکھتا ہے۔

آں مسجد و مدرسہ بنا نہادہ و بنفائس کتب و غرائب موشح گردانیدہ و بات بسیار مسجد و مدرسہ وقف فرمودہ۔" (تاریخ فرشتہ جلد اول)

محمود ہی کے دور میں جب اس کے بیٹے شہاب الدین مسعود کو لاہور کا گورنر بنایا گیا تو اس نے بھی اپنے والد کا تتبع کرتے ہوئے مدارس کی طرف خاص توجہ دی۔ اس نے غزنی سے ماہرین تعلیم بلوائے اور بڑے شہروں میں جا بجا مدارس کی بنیاد رکھی۔ ان علماء میں اس وقت کے جید عالم شیخ اسمعیل (المتوفی ۴۴۸ھ) قابل ذکر ہیں۔ جو اپنے ساتھ حدیث و فقہ کا کافی ذخیرہ لائے۔ چنانچہ فرشتہ مسعود کے حالات قلم بند کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

" در اوائلِ سلطنت اودر ممالک محروسہ چنداں مدارس و مساجد بنیاد نہاد کہ زباں از تعداد آں عاجز است"

(فرشتہ جلد اول ص ۱۱۳)

اس کے دور حکومت میں اتنے مدارس و مساجد قائم کئے گئے کہ جن کو بیان کرنے سے زبان قاصر ہے۔

ہندوستان میں اسلامی نظام تعلیم کا یہ ابتدائی دور تھا۔ اس لئے نصاب اس قدر مختصر مرتب کیا گیا جس سے دینی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان عہد میں علم نحو میں کافیہ، فقہ میں ہدایہ، تفسیر میں کشاف اور حدیث میں مشارق الانوار کی تدریس پر اکتفا کیا گیا۔ مسعود کے بعد بیرم کے عہد میں بھی شیخ

نظامی اور سید حسن غزنوی جیسے علماء نے اسی نصاب کو برقرار رکھا اور بعد میں ان کے تلامذہ بھی اسی نصاب کی تدریس فرماتے رہے۔ بلبن کے عہد تک اس نصاب میں دو چار کتب کے اضافہ سے اس نصاب کی تدریس ہوتی رہی۔ طبقات ناصری کے مصنف کے بیان کے مطابق سید مولی نے دہلی میں ایک مرکزی ادارہ قائم کیا۔[1] اس ادارہ نے مدارس کی تنظیم کے لئے ایک اہم کردار ادا کیا اور مدارس کے لئے ایک نصاب مرتب کیا' جس میں مندرجہ ذیل کتب پڑھائی جاتی تھیں۔

۱۔ علم نحو:۔ مصباح۔ کافیہ۔ لب الالباب۔ ارشاد

۲۔ فقہ:۔ ہدایہ

۳۔ اصول فقہ:۔ منار۔ اصول بزدوی

۴۔ تفسیر:۔ مدارک۔ بیضاوی۔ کشاف

۵۔ حدیث:۔ مشارق الانوار۔ مصابیح السنہ

۶۔ علم الکلام:۔ شرح صحائف

۷۔ تصوف:۔ عوارف المعارف۔ فصوص الحکم۔ نقد النصوص۔ لمعات۔

۸۔ ادب:۔ مقامات حریری

۹۔ منطق:۔ شرح شمسیہ

اس دور کے علماء نے جن میں حضرت شیخ فرید گنج شکرؒ، شیخ بہاؤ الدینؒ، شیخ بدر الدین غزنویؒ قطب الدین بختیار کاکیؒ، شمس الدین خوارزمی اور برہان الدین بلخیؒ جیسے بزرگوں کے نام سرفہرست لکھے جا سکتے ہیں۔ اسی نصاب کی تدریس فرمائی۔ بعد ازیں جلال الدین خلجی کے دور میں بھی مولانا سید رکن الدینؒ۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ۔ فخر الدینؒ۔ نصیر الدینؒ۔ تاج الدینؒ۔ اور علاؤ الدین صدر الشریعہؒ جیسے علماء نے اس نصاب کو برقرار رکھا۔

برصغیر کی اسلامی درسگاہوں میں ایک عرصہ تک یہی نصاب معمول رہا۔ سکندر لودھی کے دور میں بلبن کے دور کے مرتبہ نصاب میں ۸۹۳ھ کے لگ بھگ مندرجہ ذیل کتب اور داخل نصاب

---

[1] طبقات ناصری ص ۶۳۷

کردی گئیں۔

نحو میں شرح جامی۔ فقہ میں شرح وقایہ۔ بلاغت میں مختصر اور مطول۔ علم کلام میں شرح عقائد نسفی۔ مواقف اور اصول فقہ میں توضیح تلویح۔

اکبر کا عہد حکومت جہاں اور بہت سی تبدیلیوں کا باعث بنا، وہاں اس کا اثر ہمارے نصاب تعلیم پر بھی بہت گہرا پڑا۔ ان اہم تبدیلیوں کا ذکر ابوالفضل نے آئین اکبری میں بھی کیا ہے۔ ۹۹۵ھ میں اکبر نے مدارس میں علوم نقلیہ (قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ) میں بے انتہا کمی کر کے علوم مروجہ فلسفہ، طب، ریاضی، نجوم، ہیئت کیمیا وغیرہ مضامین کی تدریس کے احکامات جاری کر دیئے[1] اور اس کے لئے بیرونی ممالک سے ماہرین تعلیم بلوائے۔ ان حالات کا تذکرہ مصنف مآثر الکرام نے یوں کیا ہے

"تصانیف علمائے متاخرین ولایت مثل محقق دوانی و میر صدرالدین و میر غیاث منصور و مرزا جان میر بہ ہندوستان آورد و در حلقۂ درس انداخت و جم غفیر از حاشیۂ عقل استفادہ کردند و ازاں عہد معقولات رواج دیگر پیدا شد" (مآثر الکرام)

بابر کے علمائے متاخرین جیسے محقق دوانی میر صدرالدین میر غیاث منصور اور مرزا جان میر کی تصانیف ہندوستان میں لائی گئیں اور حلقۂ درس میں شامل ہوئیں اور ایک کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا اور اس طرح اس عہد سے معقولات کا رواج عام ہوا۔

لالہ سیل چند نے بھی اکبر کی انہی تبدیلیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"در عہد جلال الدین محمد اکبر شاہ جا بجا مدرسہا بودند، استادان فارس و شیراز تعلیم می فرمودند" (تفریح العارات)

جلال الدین محمد اکبر شاہ کے عہد حکومت میں جگہ جگہ مدرسے تھے اور ان میں فارس اور شیراز کے استاد تعلیم دیتے تھے۔

اس تبدیلی سے ہمارا تعلیمی نصاب ایک ایسے موڑ پر آ کھڑا ہوا جہاں سے دو الگ الگ راستے نکلتے تھے

---

[1] منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۶۳

ایک گروہ نے تو حکومت کے احکامات پر صاد کرتے ہوئے علوم مروجہ کو اپنا لیا اور ان کے نصاب میں علوم نقلیہ کم اور عقلیہ بہت زیادہ تعداد میں داخل ہوئے۔ دوسرے مکتب فکر کے علماء نے اس کے ردعمل میں علوم نقلیہ اور زیادہ داخل نصاب کئے اور علوم عقلیہ برائے نام رکھے۔ ان دوسرے مکتبۂ فکر کے علماء میں حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کا نام سرفہرست لکھا جاسکتا ہے۔ جنہوں نے محلہ بہشت بہشت میں اپنا ایک الگ مدرسہ قائم کیا۔ آگرہ میں مولانا علاؤالدین نے اسی قسم کے نصاب کے لئے اپنا ایک الگ مدرسہ قائم کیا۔ ان حضرات کے تلامذہ نے بھی اپنے اساتذہ کے تتبع میں اسی نصاب کے مدارس ہندوستان کے دوسرے شہروں میں قائم کئے۔ لیکن ہند و پاک کے اکثر مدارس نے پہلی قسم کے ہی نصاب کو اپنایا اور لاہور، احمدآباد، دہلی، سیالکوٹ، جونپور اور ٹھٹھہ وغیرہ شہروں کے مدارس میں پہلی ہی قسم کا نصاب داخل درس رہا۔ چنانچہ شاہ جہاں کے عہد میں ملا عبدالوہاب، ملا یوسف، ملا جمال، ملا قطب الدین سہالوی اور اورنگ زیب کے دور میں ملا محمد جیون، قاضی محمد حسن جونپوری، محمد حسن خیرآبادی، سید نظام ٹھٹھوی اور ملا محمد فائق جیسے علماء نے اسی نصاب کو داخل تدریس کیا۔

ہندوستان میں اسلامی نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کے سلسلہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، آپ نے اپنی متعدد کتب میں تعلیم و تعلم میں ماہرین تعلیم کی رہنمائی فرمائی ہے۔ ان خامیوں کو اجاگر کیا ہے جو طریقۂ تعلیم کے سلسلے میں متعلمین کے لئے مشکلات پیدا کرسکتی ہیں۔ ان نئے علوم سے روشناس کرایا ہے جو کتاب و سنت کی تفہیم میں معاون بن سکتے ہیں۔ اور ان طریقوں کا ذکر کیا ہے جو نظام تعلیم میں نئی تبدیلیاں لاسکتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے مدارس کا نصاب اس قدر منتشر ہوگیا تھا کہ اس کا کسی ایک لڑی میں پرو دیا جانا از حد ضروری تھا اس کے لئے ہندوستان کے مشہور رجید عالم مولانا قطب الدین کے فرزند ملا نظام الدین فرنگی محلی (المتوفی ۱۱۶۱ھ) نے ایک نصاب تیار کیا جو آج "درس نظامی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ملا صاحب کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ شرح مسلم الثبوت۔ شرح مینار۔ حاشیہ صدرا اور حاشیہ شمس بازغہ آپ ہی کے علمی خزینہ کی ایک جھلک ہیں۔ ملا صاحب نے جو نصاب ترتیب فرمایا تھا اس میں مندرجہ ذیل کتب شامل تھیں۔

۱۔ صرف :۔ میزان، منشعب، صرف میر، پنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ
۲۔ نحو :۔ نحو میر، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی
۳۔ منطق :۔ صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر، سلم العلوم
۴۔ بلاغت :۔ مختصر المعانی۔ مطول تا۔ انا قلت
۵۔ حکمت :۔ میبذی۔ صدرا۔ شمس بازغہ
۶۔ ریاضی :۔ خلاصۃ الحساب۔ تحریر اقلیدس۔ مقالہ اولی۔ رسالہ قوشجیہ۔ تشریح الافلاک۔

شرح چغمنی باب اوّل

۷۔ فقہ :۔ شرح وقایہ اولین۔ ہدایہ اخیرین
۸۔ اصول فقہ :۔ نور الانوار۔ توضیح تلویح۔ مسلم الثبوت
۹۔ علم کلام :۔ شرح عقائد نسفی، شرح جلالی، میر زاہد، شرح مواقف
۱۰۔ تفسیر :۔ جلالین۔ بیضاوی
۱۱۔ حدیث :۔ مشکوٰۃ المصابیح

ملا نظام الدین کے مترتبہ اس نصاب میں چند اور کتب مثلاً صرف میں علم الصیغہ، ادب میں نفحۃ الیمن، سبعہ معلقات، دیوان متنبی، مقامات حریری، حماسہ
منطق میں۔ ملا حسن، حمد اللہ، ملا جلال، تحریر العلوم
فرائض میں۔ شریفیہ
مناظرہ میں۔ رشیدیہ
اصول حدیث میں۔ شرح نخبۃ الفکر
حدیث میں۔ بخاری۔ مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ کا اور اضافہ بعد میں کیا گیا۔

چنانچہ آج اسی پورے نصاب کو ہمارے مدارس میں درس نظامی کے نام سے پڑھایا جاتا ہے۔ ادبی نصاب اس وقت بھی داخل تدریس تھا، جب ہندوستان میں مغل تاجداروں کی حکومت کا چراغ گل ہو رہا تھا۔

انگریز کے ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد حالات نے پلٹا کھایا۔ اس نصاب کو

پڑھ کر مدارس سے سند فراغت لینے والے وہ طلبہ جو اسلامی دور حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے تھے، مسجد کے پیش امام اور مدارس کے معلم بن کر رہ گئے۔ انگریز کو کیا ضرورت تھی کہ وہ ان مدارس کی تنظیم کرتا یا کسی ایسے نصاب کی کتب سے مدارس کو روشناس کراتا جو جدید مغربی تحقیقات پر مبنی ہوں۔ ابتداء میں اسے صرف ایسے کلرکوں اور بابوؤں کی ضرورت تھی جو اس کی حکومت کو چلا سکیں چنانچہ اس نے اپنی طرز کے اسکول کھولے اور ان سے فارغ التحصیل طلبہ کو وہ اچھے عہدوں کی پیش کش کرنے لگا۔ ہندوؤں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی پوری توجہ ان کالجوں کی جانب مبذول کر دی جس کے نتیجے میں حکومت کے شعبوں میں انگریز و ہندو چھا گئے اور مسلمان انہیں خلاف شرع خیال کر کے اپنی مسجد و خانقاہ تک محدود ہو کر رہ گئے۔

اس صورت حال کی وجہ سے مسلمانوں میں یہ عام رجحان پیدا ہو گیا کہ مذہب ایک الگ چیز ہے اور کاروبار حیات اس سے مختلف ہے دنیاوی تعلیم تو وہ ہے جو کالجوں میں حاصل کی جائے اور دینی تعلیم محض وہ ہے جو عربی مدارس میں دی جاتی ہے۔ اس طرح مدرسہ و کالج دو الگ راستے یا دو الگ نظام تعلیم بن گئے۔ گو کہ مدرسہ اور کالج کے دونوں نظاموں کے ملاپ کی کوششیں بھی کی گئیں لیکن ان کا کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہ ہو سکا ان کوششوں میں پہلی کوشش ۱۸۹۳ء مطابق ۱۳۱۱ھ میں مدرسہ فیض عام کانپور کی سالانہ دستار بندی کے موقع پر علماء کے باہمی مذاکرات تھے، جس نے ۱۳۲۶ھ میں لکھنؤ میں دار العلوم ندوہ کی شکل اختیار کی۔ بعد میں دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اس کی ایک کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود مدرسہ اور کالج کے دو مختلف تصورات کو دماغوں سے نہ نکالا جا سکا اور ہندوستان میں دار العلوم دیوبند کو جہاں "درس نظامی" کا نصاب رائج تھا خالص مذہبی، اور علی گڑھ کالج کو جہاں علوم جدید پر زیادہ زور تھا، خالص دنیاوی سمجھا جانے لگا۔ جب کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی حیثیت دنیاوی اور دینوی دونوں طرح کی متصور ہوتی تھی۔ ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت میں گو کہ دونوں گروہوں، یعنی کالجوں کے تعلیم یافتہ گروہ اور عربی مدارس کے فارغ التحصیل علماء کے گروہ کو شانہ بشانہ کام کرنے کا موقع ملا لیکن اس کا نصاب یا طریقۂ تعلیم پر کوئی اثر نہ پڑا۔ تحریک پاکستان میں بھی علماء اور نئی تعلیم کے پیدا شدہ رہنما شریک کار رہے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد بھی مولوی

اپنی جگہ مولوی ہی رہا اور مسٹر اپنی جگہ "مسٹر"۔ مسٹر کو زعم تھا کہ وہ جدید سائنسی تحقیقات سے واقف اور جدید افکار سے آشنا ہے جب کہ "مولوی" کے پاس منقولات کو چھوڑ کر معقولات میں جو علم ہے وہ وہ جدید تقاضوں کی تلافی ہرگز نہیں کر سکتا۔ لہذا "مولوی" اچھا فقہ داں یا عالم حدیث تو ہو سکتا ہے لیکن اچھا ریاضی داں جغرافیہ داں اچھا کیمسٹ یا فلسفی ہرگز نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ان علوم کا بہت کم حصہ اس کے پاس ہے۔ "مولوی" اپنی جگہ مصر تھا کہ وہ اپنے نصاب میں کسی تبدیلی کو برداشت نہیں کریگا۔ اس کی نصابی کتب اسلاف کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔ گو کہ اس کا نصاب دقیق ہے لیکن اس سے وہ اپنے متعلمین میں ایسی پختگی پیدا کر دیتا ہے جو کالجوں اور اسکولوں میں ممکن نہیں بے شک اس کے اس نصاب سے متعلمین کو سالہا سال کی محنت شاقہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن اس کا طالب علم ہر فن کا جسے وہ پڑھتا ہے، شناسا ہو جاتا ہے اس کے نتیجے میں اگر اسے "دنیاوی" عزت نہیں ملتی تو کوئی حرج نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ مدارس کا فارغ صرف پیش امام اور مکتب کا مدرس ہو کر رہ گیا۔ اور "مسٹر" دفتر نشین ہو کر اپنے حال میں مگن ہو گیا۔ حالانکہ قیام پاکستان کے بعد اسے ایک صحیح اسلامی مملکت بنانے کے لئے دونوں کا تعاون اشد ضروری تھا۔ قصور کس کا ہے؟ اس وقت یہ ہمارا موضوع گفتگو نہیں ہے سوال یہ ہے کہ کیا ہم اپنے درسی نصاب کا از سر نو جائزہ نہیں لے سکتے؟ اگر "نہیں" تو کیا یہ نصاب جس میں ہم (ماسوا منقولات) پرانے فلسفہ، ریاضی کے پرانے اور دقیق ترین فارمولوں۔ کیمیا اور ہیئت کے متروک ابحاث پر قانع ہو جاتے ہیں، عہد حاضرہ میں کافی ہے؟ کیا علوم جدیدہ کی تحصیل کے بغیر مخالفین اسلام کا منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں؟ جدید افکار سے واقفیت کے بغیر کیا ہم اسلامی افکار کی دوسرے ممالک میں کامیابی سے اشاعت کر سکتے ہیں؟ غرض یہ کہ اسی قسم کی اور مشکلات بھی ہمارے علماء کے سامنے ہیں اور حالات کے مطابق اس سے کہیں بڑھ کر دشواریاں درپیش ہیں۔ جن کا اگر آج نہیں تو کچھ عرصہ بعد لازماً احساس کیا جائیگا۔

اس سلسلے میں پہلی بات جو "درس نظامیہ" کے نصاب کی فہرست پڑھتے ہی ذہن میں آتی ہے یہ ہے کہ اس پورے نصاب میں بنیادی مذہبی کتب دو چار ہی ہیں تقریباً پچاس کتب میں مشکوٰۃ (حدیث) جلالین و بیضاوی (تفسیر) اور ہدایہ و شرح وقایہ (فقہ) ہی صرف ایسی کتب ہیں جو مذہبی ہیں۔ اس کے علاوہ جتنی کتب بھی ہیں یا تو وہ ان کتب کے لئے مبادی و لوازم کی

حیثیت رکھتی ہیں اور یا پھر علوم مروجہ سے متعلق ہیں جن کا بلحاظ وقت چرچا رہا ہے۔ وہ کتب جو مقصود بالغرض نہیں میری مراد علوم آلیہ کی کتب سے ہے، انہیں مقصود بالذات بنا لیا گیا ہے صرف نحو یا گرامر کی تیرہ چودہ کتب میں قواعد کی تکرار زیادہ ہے، مشق بالکل نہیں یا پھر نہ ہونے کے برابر ہے۔ شرح جامی جو کہ نصابی حیثیت سے تو گرامر کی کتاب ہے لیکن اس میں گرامر کو بھی عقلیت کا رنگ دیا گیا ہے۔ علم کلام کی پانچ چھ بڑی بڑی کتب ہیں ان مسائل و مشکلات کا ذکر تک موجود نہیں، جن سے آج ہمارے مدارس کے فارغ التحصیل کو واسطہ پڑ رہا تھا۔ آج علم کلام کے نئے مسائل درپیش ہیں جن کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

ریاضی کی تقریباً چھ کتب میں وہ آسانیاں بالکل نہیں ہیں جو جدید الجبرا، جیومیٹری اور حساب نے مہیا کردی ہیں۔ منطق کی تقریباً گیارہ کتب پڑھا کر متعلم کو اچھا خاصا منطقی ضرور بنا دیا جاتا ہے جس سے وہ قضیوں اور سفسطوں میں اچھی خاصی مہارت بھی پیدا کر لیتا ہے لیکن یہ مقصود بالذات ہرگز نہیں شاید اسی لئے ابن خلدون نے لکھا ہے کہ

فیکون الاشتغال بھذہ العلوم الالیۃ تضیعاً للعمر و شغلاً بما لا یعنی" (مقدمہ)

ان علوم آلیہ سے اشتغال عمر کا ضائع کرنا اور ایسے امور سے دلچسپی کے مترادف ہے جن سے کوئی فائدہ نہ ہو۔

مزید طرہ یہ کہ ہمارے ہاں معقولات میں بہت سی ایسی کتب زیر درس رہتی ہیں جن میں متعدد فنون خلط ملط ہو کر رہ جاتے ہیں۔ متعلم بے چارہ پریشان ہو جاتا ہے کہ وہ کس فن کی کتاب پڑھ رہا ہے اور مباحث کچھ اور ہی نظر آتے ہیں بقول شخصے "احوال ایں قوم دیبرت ایشاں" والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ملا حسن، حمد اللہ اور قاضی مبارک وغیرہ منطق کی کتب ہیں لیکن ان کے اکثر مباحث الہیات، مابعد الطبیعہ، علم باری، جعل بسیط، جعل مرکب، کلی طبعی کا وجود فی الخارج اور وجود ذہنی وغیرہ سے متعلق ہیں۔

ہمارے درس کی اکثر کتب نفس مضمون سے زیادہ لفظی مباحث سے پر نظر آتی ہیں شمسیہ ہی کے ایک جملے میں جس میں مصنف نے لکھا تھا العلم ما تصور فقط و ھو الخ

قطبی اور میر کے کئی صفحے صرف اس بحث پر لگ گئے ہیں کہ "ھو" کی ضمیر کس طرف پھرتی ہے۔

ہمیں اب اپنے پورے نصاب کا تفصیلی جائزہ لینا ہوگا جس میں منقولات کے حصہ کو برقرار رکھتے ہوئے علوم آلیہ اور معقولات کے حصے میں نہایت اہم تبدیلیاں کرنا ہوں گی صرف ونحو میں مختصر اور جامع کتب قواعد منتخب کرکے جدید طریقوں کے مطابق مشقوں پر زیادہ زور دینا مناسب ہوگا۔ ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، اقتصادیات، شہریت جیسے علوم کی ابتدائی کتابیں داخل نصاب ہونا ضروری ہیں۔ اس سے بقول مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ میں نہیں سمجھتا کہ کس اجر میں فرق پڑے گا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"ہم تو صحیح بخاری کے مطالعے میں اجر سمجھتے ہیں، میرزا ہدایہ امور عامہ کے مطالعہ میں بھی ویسا ہی اجر سمجھتے ہیں۔"

(ملفوظات اشرف علیؒ اشاعت ماہ ربیع ۱۳۶۱ھ)

افکار نو اور جدید تحقیقات سے روشناس ہونے کے لئے ہمیں مجبوراً کسی غیر ملکی زبان کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ ایسی زبان جس میں علوم کا سب سے زیادہ ذخیرہ موجود ہو اور پھر جس کے ذریعہ ہم اسلامی افکار و تعلیمات سے دنیا والوں کو روشناس کرا سکیں۔ جس کے ذریعے بیسویں صدی کے انسان پر اسلام کی حقانیت پیش کر سکیں جو آج فطرت کی تسخیر کے باوجود اپنی ذات کی تسخیر نہیں کر سکا ہے جو اس مادی دور کے کھوکھلے نظریوں سے اکتا کر روحانی سکون کا متلاشی ہے۔ شاید اسی کمی کو محسوس کرتے ہوئے مولانا شبلی مرحوم نے کہا تھا۔

تعلیم میں جب تک یورپ کی کسی زبان کی تعلیم
لازمی نہ قرار دی جائے اور زمانہ موجودہ کے علوم وفنون
نہ پڑھائے جائیں اس وقت تک مذاق حال کے موافق
کیونکر ارباب قلم پیدا ہو سکتے ہیں۔"

(مقالات شبلی جلد ہشتم ص ۶۸ مطبع اعظم گڑھ)

یہ معروضات نہ تو کسی طویل بحث کا آغاز ہیں اور نہ غلط فہمی کی کسی

تحریک کا کوئی باب۔ چند ذاتی تجربات و شواہد کی روشنی میں پیدا ہونے والے وہ حقائق ہیں جنہیں ہمارے علماء ضرور محسوس کریں گے۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ اور آئندہ کو بدلے گا۔ اب ہمارے اکابر علماء کا فرض ہے کہ وہ وقت کی پکار سنیں اور پھر مدارس کے نظام کا بنظرِ غائر جائزہ لیں۔

"اور اگر مسلمان علماء کے شاندار علمی کارنامے نہ ہوتے تو یورپ ابھی تک جہالت اور تکبت میں پڑا سڑا کرتا۔ کئی طویل صدیوں تک دنیا کی روحانی روشنی اسلامی ممالک ہی سے پھوٹتی رہی۔ اس کے بعد دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی چنانچہ جہاں یورپ مادی اور معنوی دنیا کی تسخیر کے لئے نکل پڑا، وہاں مشرق قدیم مذہبی کتابوں کی خشک تاویلات اور ان کی نقلیں کرنے میں لگا رہا۔ اس نے اپنے آپ کو اس حد تک ماضی کے حوالہ کر دیا کہ وہ گویا اس کے اندر محدود ہو کر فرسودگی کی نذر ہو گیا۔ یورپ میں صدیوں تک چھاپہ خانوں میں شائقین کے لئے کتابیں چھپا کیں، اور اس کے بعد کہیں جا کر سلطنت ترکی کے شیخ الاسلام نے ۱۷۲۹ء میں باقاعدہ فتوے کے ذریعہ کتابوں کے چھاپے خانے کو عمل شیطان کے الزام سے سبرئی ہونا قرار دیا۔ یورپ میں انجیل مقدس وہ کتاب تھی جسے سب سے پہلے چھاپا گیا۔ اور انجیل کے وہاں جو ترجمے ہوئے، وہ مختلف زبانوں کی نشوونما اور ان کے ادب کی ترقی کا باعث بنے اس کے برعکس دین اسلام قرآن مجید کے دوسری زبانوں میں ترجمے نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان عوام سے الگ تھلگ رہا یہاں تک کہ آخر میں مصطفیٰ کمال کی اصلاحات نے اس مقدس کتاب کو ان بزرگوں کے لئے جو عربی نہیں جانتے تھے، قابل فہم بنایا۔

اردو ترجمہ از پروفیسر ڈاکٹر الحاج عبدالکریم جرمانوس (ہنگری)